© rasailojaraid.com

فلسفۂ انسانیت کا ایک تنقیدی جائزہ

از جناب ڈاکٹر محمد نور نبی صاحب لکچرر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(گذشتہ سے پیوستہ)

جین پال، سارترے[۲۶] (JEAN PAUL SARTRE) جو فلسفہ وجودیت کا اہم حامی و علمبردار ہے فلسفۂ انسانیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فلسفۂ انسانیت دو مختلف معنوں میں مشتمل ہے۔ ایک معنی میں فلسفۂ انسانیت انسان کو بذاتِ خود مقصود و منتہا قرار دیتا ہے اور اس کو سب سے بلند و برتر قدر (VALUE) عطا کرتا ہے۔ اِس نظریہ کی نشان دہی مثال کے طور پر کوکٹین کی کہانی (COCTEAN'S STORY) 'اسّی گھنٹوں میں، دنیا کی سیر' میں واضح طور پر ملتی ہے۔ اس کہانی میں ایک کردار اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ چونکہ وہ ایک ہوائی جہاز میں پہاڑوں کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ لہٰذا انسان عظیم الشان (MAN IS MAGNIFICENT) ہے۔ یہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اگرچہ میں نے ذاتی طور پر ہوائی جہاز کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام نہیں دیا ہے تاہم مجھے

---

[۲۶] جین پال سارترے :- جین پال سارترے ایک ناولسٹ، افسانہ نگار اور فلسفی ہیں۔ وہ ۲۱ر جون ۱۹۰۵ء کو پیرس میں پیدا ہوئے۔ فلسفہ میں ان کی خاص تصنیف 'L' ETRE ET LE NEANT' ہے جو کہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ فلسفی کی حیثیت سے ان کا شمار فلسفہ وجودیت کے پیرو میں ہوتا ہے۔ وہ ہیگل اور کرکے گارڈ سے متاثر ہیں۔

(THE CONCISE ENCYCLOPAEDIA OF WESTRN PHILOSOPHY AND PHILOSOPHERS, P. 353)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان مخصوص ایجادات وانکشافات سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے اور بحیثیت ایک انسان ہونے کے میں اپنے آپ کو ذاتی طور پر ان کارناموں کا موجد وبانی اور صاحبِ فخر وامتیاز تصور کرسکتا ہوں جو کہ محض چند مخصوص انسانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ سارتر کا کہنا ہے کہ ایسا اقرار کرنا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ ہم انسان کو ان تمام غیر معمولی، اعلیٰ ومخصوص کارناموں کے لئے جو چند مخصوص انسانوں کی محنتوں کا ثمرہ ہیں۔ قدر ومنزلت ودیعت کرسکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا فلسفۂ انسانیت مہمل اور لغو ہے کیوں کہ صرف کُتا یا گھوڑا ہی انسان کے متعلق ایسی عام رائے قائم کرسکتا ہے اور اعلان کرسکتا ہے کہ 'انسان عظیم الشان ہے'، لیکن شاید وہ لوگ بھی اس احمقانہ رائے کی تائید نہیں کریں گے۔

فلسفۂ وجودیت اس قسم کے تمام فیصلوں کو مسترد قرار دیتا ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق انسان کو کسی بھی طور پر منتہی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی کوئی آخری منزل طے کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ابھی انسانیت کے متعلق بہت کچھ تعین کرنا باقی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ فلسفہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہمیں انسانیت کے لئے کوئی بھی متعین نظریہ پیش کرنے کا حق نہیں ہے جس طرح سے کہ اگست کومٹے نے انسانیت کا ایک خاص نظریہ پیش کیا۔ ایسا کرنا مسلک فاشتی (FASCISM) کے مترادف ہوگا۔

لیکن فلسفۂ انسانیت کا ایک دوسرا نظریہ ہے جس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ انسان دائمی طور پر اپنے آپ سے پرے ہے۔ اس کا (انسان) وجود اپنے آپ سے پرے ہی فنا ہونے میں اور اس میں اپنی ذات کی عکاسی میں ہے۔ مزید برآں وہ ماورائی مقاصد (TRANSCENDENT AIMS) پر گامزن رہتے ہوئے ہی اپنے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان اپنے آپ سے تجاوز کرنے والا (SELF SURPASSING) ہے۔ لہٰذا وہ بذاتِ خود اپنے ماورائی عالم کا قلب ومرکز ہے۔

انسانی کائنات کے علاوہ کوئی دوسری کائنات نہیں ہے۔ صرف وہ کائنات ہے جو انسان سے منسلک ہے۔ یہ ماورائیت کارشتہ انسانی ساخت کی شکل میں (اس حیثیت سے (HUMAN SUBJECTIVITY) نہیں جس طرح اللہ تبارک تعالیٰ ماورائی (TRANS CENDENT) ہے بلکہ ماورائی اس معنی میں کہ وہ اپنے آپ سے تجاوز کرے) داخلیت (SUBJECTIVITY) کے ساتھ (داخلی اس معنی میں نہیں کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان اپنے تئیں قید و بند میں جکڑا ہوا ہے بلکہ اس معنی میں کہ انسان دائمی طور پر انسانی کائنات میں حاضر ہے یہ وہ تصور ہے جس کو ہم وجودی فلسفۂ انسانیت (EXISTENTIAL HUMANISM) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ فلسفۂ انسانیت اس لئے ہے کیوں کہ اس میں ہم انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود اپنے آپ کا قانون ساز ہے اور اس کو خود سے اپنی راہ متعین کرنی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم اس پر یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ صحیح معنی میں انسانیت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ خودی سے پہلو تہی اختیار کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے سے پرے مقصد کی جستجو میں لگا رہتا ہے اور یہی جستجو اس کی آزادی کی جستجو ہے۔

فلسفۂ وجودیت اس معنی میں لادینیت نہیں ہے کہ یہ خدا کے وجود کی نفی میں عبوری طور پر دلائل فراہم کرتا ہے بلکہ اگر خدا کے وجود کا اقرار بھی کر لیا جائے تو اس فلسفہ کے بنیادی نظریہ میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا ہے کیونکہ انسان کے لئے اصل مسئلہ وجودِ باری تعالیٰ نہیں ہے بلکہ خودی کی تلاش ہے۔ (IT IS TO FIND HIMSELF) تاکہ یہ بات اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ کوئی بھی شے حتیٰ کہ وجودِ باری تعالیٰ کے ٹھوس دلائل بھی ان کو ان کی خودی سے نجات نہیں دلا سکتی ہے۔[۲۷]

اب ہم اشتراکیت (MARXISM SOCIALISM) کی طرف آتے ہیں۔

اشتراکی مفکر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ فلسفۂ انسانیت اشتراکیت سے بہت پہلے ایک مخصوص نقطۂ نظر کی حیثیت سے عالمِ وجود میں آیا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ شہری متوسط طبقہ (BOURGEOISIE) نے جاگیردارانہ نظام اور مطلقیت (ABSOLUTISM) کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس زمانہ کے فلسفۂ انسانیت کے شیدائیوں میں ڈانٹے (DANTE) پیٹریارک (PETRARCH) لیونارڈو ڈے ونسی (LEONARDO DA WINCI) کوپرنیکس (COPERNICUS) شیکسپیر (SHAKESPEARE) وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی تصانیف میں

۲۷: JEAN PAUL SARTRE, EXISTENTIALISM AND HUMANISM, (LONDON, 1952) PP- 54 - 56.

HISTORY OF PHILOSOPHY, EASTERN AND WESTERN, PP. 434-435.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاگیردارانہ نظام (FEUDAL ORDER) اور جاگیردارانہ نظریئے پر شدید نقطہ چینی کی۔ انھوں نے بتایا کہ فلسفۂ انسانیت کے بنیادی مقاصد اسی نظام میں حاصل کئے جاسکتے ہیں جس میں شخصی ملکیت (PRIVATE PROPERTY) کا اصول کارفرما ہو۔[۲۸]

بورژوا نظریہ کے خلاف یوٹوپین سوشلزم (UTOPIAN SOCIALISM) ملکیتِ عامہ (COMMON PROPERTY) کا اصول پیش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا حامی ہے کہ سوسائٹی کے ہر فرد کے لئے کام کرنا لازمی قرار دیا جائے۔ اور تقسیمِ دولت کا معیار ضروریات پر مبنی ہو۔ اس طرح یہ لوگ سماجی رشتے میں انقلاب کے ذریعے انسانی آزادی کو حاصل کرنا اور انسانی شخصیت کی نشوونما کرنا چاہتے ہیں۔ انسانی سرمایہ (HUMAN LEGACY) کی قدر و قیمت، ان کے مطابق، انسانیت کی خودداری انسانی شخصیت کی مکمل نشوونما اور آزادی (LIBERTY) رواداری (EQUALITY) اور اخوت (FRATERNITY) کی ہمہ گیر قدروں میں مضمر ہے۔ پرولستاری (THE PROLETARIATE) مفکرین کی رو سے فلسفۂ انسانیت عام طور پر (HUMANISM IN GENERAL) نہ تو کسی تاریخی دور کے ورثہ میں آیا اور نہ موجودہ دور میں ہی ہے۔ مارکسزم لیننزم فلسفۂ انسانیت کے مسائل کو مُبینہ درجاتی عہدہ (CLEARLY DEFINED CLASS POSITIONS) کے لحاظ سے اپناتا ہے۔

کارل مارکس[۲۹] (CARL MARX) اشتمالیت کو حقیقی فلسفۂ انسانیت قرار دیتا ہے۔ اپنا مشہور فارمولا

---

[۲۸] FORTH STUDY OF THE HUMANISTS OF THE RENAI SSANCECEC J. W. MACKAIL, STUDIES IN HUMANISM (LONDON, 1938)

[۲۹]: کارل مارکس جرمنی کے ٹرائر میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اور لندن میں ۱۸۸۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنی انتھک کوشش اور تعمیری ذہانت سے انسانی معاشرہ کے لئے اصول مرتب کئے اور انھیں اصولوں کی بنیاد پر وہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب لایا۔ وہ علم معاشیات (ECONOMICS) اور علم تمدن (SOCIOLOGY) کا عالم تھا۔ لیکن انسانی زندگی کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے اس نے اپنا مادی فلسفہ پیش کیا جو کہ ہیگل کے نظریۂ عینیتِ مطلق (ABSOLUTE IDEALISM) کے بالکل متضاد تھا۔
(THE CONCISE ENCYCLOPAEDIA OF WESTERN PHILOSOPHY AND PHILOSOPHERS, P. 248)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اشتمالیت (COMMUNISM) فلسفۂ انسانیت کے مساوی ہے۔ یہ ایک عملی اور اثباتی فلسفۂ انسانیت ہے۔

یوٹوپین سوشلسٹس (UTOPIAN SOCIALISTS) کا کہنا ہے کہ موجودہ دور کی انقلابی جدوجہد ایک عظیم فلسفۂ انسانیت کی تحریک ہے، اور اسی جدوجہد کی مدد سے ایک ایسے عالم کا قیام ممکن ہے جس میں تشدد و غلامی کا نام و نشان نہیں ہوگا۔[۳۰]

اس طرح فلسفۂ انسانیت کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد جب اس پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ یوروپ میں دورِ جدیدہ میں فلسفۂ انسانیت کی تحریک کلیسائیت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک تحریک تھی۔ اس تحریک نے عظیم فرانسیسی انقلاب اور ان کے بلند مقاصد کو جنم دیا۔ انسان کے فطری حقوق کو اپنایا اور ساتھ ہی ساتھ عوام کی خود مختاری، آزادی، مساوات اور اخوت جیسے پاک تصورات کو منظرِ عام پر لایا۔ لیکن اگر عملی اعتبار سے پرکھا جائے تو اس تحریک میں بجائے اثباتی پہلو کے منفی پہلو صاف نمایاں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عظیم تحریک نے یوروپی عوام کو کلیسائی جبر و اقتدار سے نجات دلائی۔ جاگیردارانہ نظام کو سپردِ خاک کیا، معاشی و سماجی قید و بند کو ختم کیا اور تاناشاہی و آمریت کے نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔ اگر برطانیہ کے نظریۂ افادیت پسندی (UTILITARIANISM) کے علم برداروں کے کارناموں کو دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے ایک قابلِ تحسین اور سود مند قانونی، انتظامی اور عدالتی اصلاحات نافذ کیں، مزید برآں فلسفۂ انسانیت کے حامیوں نے مذہبی اور سیاسی ظلم و تشدد و ایذا رسانی کے خلاف ایک طویل اور کامیاب محاذِ جنگ قائم کیا۔ والٹیر (VOLTAIRE) نے جس المناک کیلس سانحہ (CALAIS TRAGEDY) کا انکشاف اپنے ادبی شہ پارہ میں کیا ہے، مذہبی رواداری کے باب میں یہ ایک عظیم الشان تاریخی فتح و کامرانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[۳۰] NEWS AND VIEWS FROM THE SOVET UNION, VOL XXIII, NO. 60, SEPTEMBER 1964 - COMMUNISM SUPREME EMBODIMENT OF HUMANISM.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن سب سے زیادہ اہم اور غور طلب بات یہ ہے کہ ان واقعات کے بعد کیا ہوا؟ تاریخ گواہ ہے کہ ان تخریبی کاموں سے فراغت کے بعد جبکہ تعمیری کام کا وقت آیا اور ایک نئے نظامِ فکر کی تشکیل ہونی شروع ہوئی تو اس عظیم تحریک کے بلند و پاک تصورات ایک ایک کر کے اپنا دم توڑنے لگے اور آج وہ ایک ماضی کا داستان بن کر رہ گیا۔ اور یہی نہیں بلکہ اگر ان پاک تصورات مثلاً آزادی، مساوات اور اخوت کا بذاتِ خود جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان تصورات کا ماخذ اور بنیاد دینیت (THEISM) ہے نہ کہ مادیت (MATERIALISM)

توحید کا صحیح تصور، اللہ تبارک تعالیٰ کی وحدانیت کا حقیقی عرفان اور اس پر کامل ایمان ہی بجا طور پر آزادی، مساوات اور اخوت کے پاک تصورات کو جنم دیتا ہے۔

نظامِ مادیت جس کا انحصار انفرادی کش مکش، طبقاتی ہیجان، معاشی، معاشرتی اور سماجی بحران پر ہو۔ کسی بھی طور پر آزادی، مساوات اور اخوت کے پاک تصورات کو جنم دینا تو در کنار ان پر درش بھی نہیں کر سکتا ہے۔ تاریخی واقعات اس کے بین ثبوت ہیں۔

موجودہ نظام جس میں مادیت کا غلبہ ہے۔ جہاں ایک طرف تو رہبرانِ قوم انسانی دوستی، انسان کی بھلائی و بہبودی، و انسانی فتح و کامرانی کا نعرہ بلند کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف ایٹم و ہائیڈروجن بم، ایٹمی اسلحہ جات اور انسان کو تباہ کرنے والی مہلک تدابیر سوچے جاتے ہیں۔ لیکن بجا طور پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ کیا پیروانِ مذاہب نے انسانیت پر جور و ستم نہیں کیا؟ خدا کے نادرِ مطلقیت کا سہارا لے کر انسان کو غلام نہیں بنایا؟ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر انسانیت کشی نہیں کی؟

تاریخ ان سوالات کا جواب اثبات ہی میں دے گی، لیکن ان حقایق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی مذہب پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے۔ جتنے بھی مذہبی پیغامبر، پیشوا اور مصلح آئے۔ سبھوں نے انسانی دوستی اخوت، صداقت اور رواداری کا پیغام دنیا کو دیا۔ یہ پیغام محض نظریاتی پیغام نہیں تھا بلکہ ان لوگوں نے ان کو عملی جامہ پہنایا۔ لیکن جب لوگوں نے اس پیغام کو فراموش کر کے اپنے کو مادیت کے سپرد کیا اور بجائے خدا کے اپنی نفسانی خواہشات اور نفسانی مفادات کو خدا بنا لیا تو پھر انسانیت کی تعمیر و تشکیل کے بجائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانیت کُشی شروع ہوئی۔ بظاہر تو انھوں نے اپنے آپ کو مذہبی رنگ میں رنگا لیکن ان کے اعمال دین کے منافی تھے۔ مذہب کا دعویٰ کر کے خود اُن لوگوں نے مذہب کی بیخ کنی کی۔ اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ دنیا کی کثیر آبادی آج بھی مذہب کا ڈھونگ رچاتی ہے۔ کلیساؤں، مساجد اور مندروں کو آباد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ان کی ظاہری شکل ہے، باطن میں وہ بجائے خدا کے شخصی و نفسانی مفاد اور شخصی کش مکش کو ہوا دیتے ہیں۔ اور حقیقت میں انھیں کو اللہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے مہلک اور انسانیت کو لرزا دینے والے نتائج آج ہمارے سامنے عیاں ہیں۔ لہٰذا جب تک کہ مذہب کے اصولوں پر انسان عمل پیرا نہ ہو جائے اس وقت تک آزادی، اخوت و مساوات کے بلند و پاک تصورات کو نہ تو اپنایا جا سکتا ہے اور نہ ان کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔

ہنری برگسان (HENRY BERGSON) اپنی کتاب LES DENXSOURCES صفحات ۳۰۴-۳۰۵ پر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جمہوری تصور حقیقت میں پروٹسٹنٹ عقیدہ کی پیداوار اور اس کا منفی پہلو ہے۔ تصورِ اخوت (FRATERNITY) جمہوری نظام کو صحت بخشتا ہے لہٰذا تصورِ اخوت دینی جمہوری نظام میں ایک نمایاں اور اہم مقام رکھتا ہے۔[۳۱]

اخلاقی نظریہ افادیت کی طرح (UTILITY PRINCIPLE IN MORALS) سیاسی جمہوریت (POLITICAL DEMOCRACY) نے بھی دنیا کو محض ایک اصولی آلہ کار عطا کیا۔ اس نے انسان کے ارادہ کو بے شک فوقیت و برتری عطا کی لیکن وہ کوئی مثبت اصول دینے سے قاصر رہی جس کی بنیاد پر انسان کا مطمحِ نظر اور ان کے اغراض و مقاصد تعین کیے جا سکیں اور ان اغراض و مقاصد کی جانب ان کے ارادوں (WILL) کو مبذول کرایا جا سکے۔

اٹھارھویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب آیا۔ اس انقلاب نے انسانی فلاح و بہبود کا دم بھرا اور پرولتاری (PROLETARIAT) طبقہ نے صفحۂ ہستی پر قدم رکھا۔ لیکن یہ انقلاب بھی اس طبقہ کی شکم سیری نہیں کر سکا۔ اس انقلاب نے یقیناً شخصی آزادی (INDIVIDUAL LIBERTY) اور آزادیِ مسابقت (FREEDOM OF COMPETITION) کی ضمانت دی لیکن اس ضمانت نے

۳۱: BURGH, TOWARDS A RELIGIOUS PHILOSOPHY, PP. 206-207

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بجائے خوشی کے انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لہٰذا انھوں نے سائنسی فلسفۂ انسانیت کے اصولوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ جمہوریت کے حریت پسندانہ مقاصد ونصب العین اور انسانی اخوت و برادری کے اصول سے ان کا اعتبار جاتا رہا۔ معاشی کلیات جو انسان کو تجارتی اقرار و عہد ناموں کی آزادی (FREEDOM OF CONTRACT) ودیعت کرتا تھا اور تجارت میں مداخلت سے احتراز کرنے (THE THEORY OF LAISSEZ FAIRE) کی تبلیغ واشاعت کرتا تھا، ان کی نظروں میں بے وقعت ہوگئے، اور ان لوگوں نے ایک نیا نصب العین جو پہلے کی بہ نسبت (ان کی نظر میں) زیادہ مفید اور تعمیر پسند تھا، قائم کیا جو کہ اشتمالیت (COMMUNISM) اور اجتماعیت یا اشتراکیت (SOCIALISM) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اشتراکی طبقہ حریت پسندی (LIBERALISM) سے چاہے وہ دینی ہو یا سیاسی، اور اس سے مطابقۃً سارے امور سے نفرت کرنے لگا۔ اس طبقہ نے سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے کے لئے امن وسلامتی کے بجائے ظلم وتشدد کا بازار گرم کیا لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کرکے بین الاقوامی سطح پر مزدور طبقہ کو فوقیت وبرتری عطا کرنے کا مسودہ پیش کیا۔ اور خالص مادی نظام (MATERIALISM) میں انسانی فلاح وبہبودی کی پیشین گوئیاں کیں۔ لیکن کہاں تک یہ پیشین گوئیاں برحق ثابت ہوئیں، اس کا فیصلہ ہم اور آپ بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ڈارون[32] کے نظریۂ قدرتی انتخاب (THEORY OF NATURAL SELECTION) نے سائنسی فلسفۂ انسانیت پر کاری ضرب لگائی۔ ڈارون اور ان کے بعد ماہرینِ علمِ حیاتیات نے اس نظریہ کی جس شکل میں ترویج واشاعت کی، اس نے بجائے اخوت ورواداری کے مسابقت (COMPETITION) اور قابلیت کی بنیاد پر

۳۲: چارلس ڈارون: چارلس ڈارون ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو شریوزبری میں پیدا ہوا۔ اس نے اڈنبرا میں طب پڑھی اور کیمبرج میں دینیات۔ لیکن ان دونوں مضامین سے اس کو دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ اس کو بچپن ہی سے حکمتِ فطرت کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ اسی لئے جہاز بیگل جب تمام دنیا کے گرد چکر لگانے کے لئے نکلا تو وہ اس کے

(باقی برصفحۂ آئندہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ وہب کی طرف جھوٹی روایتیں گھڑ دیتا تھا اور اپنے باپ سے بھی موضوع احادیث منسوب کر دیتا تھا۔ وہ وراقوں سے کتابیں خریدتا تھا اور پھر انھیں اپنی بتا دیتا تھا یا سیرۃ کی کتابیں خرید کر اُن کی روایت کر دیتا تھا کہ میں نے اپنے باپ سے سنی ہیں[1] اور انھیں اپنے دادا سے منسوب کرتا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو، یہ ظاہر ہے کہ وہ ایک ذہین آدمی تھا اور وہب بن منبہ کے بیشتر اخبار اس سے حاصل ہوئے ہیں۔[2]

وہب سے ایک ترجمہ (زبور داؤد) بھی منسوب ہے جس کا نام "کتاب زبور داؤد ترجمۃ وہب ابن منبہ" بتایا جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی معروف ترجمہ ہے جسے "کتاب المزامیر ترجمۃ الزبور" کہا جاتا ہے۔ اور اس کے نسخے آج تک پائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ "علماے اسلام" کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔[3] علی ہذا القیاس وہب کی طرف کچھ مواعظ بھی منسوب کیے جاتے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے صحفِ سماوی اور حکمتِ لقمان کے مطالعے سے اخذ کیے تھے۔[4]

قصص پر وہب بن منبہ کا گہرا اثر ہے۔ چنانچہ ان یمانی قصص کی روایتوں کے بڑے حصے کا مرجع وہی ہے۔ اور یہ دو طرح کے ہیں: اسرائیلی رنگ کے قصے، جو یقیناً یہودیت کے اثر سے یمن میں گھڑے گئے پھر عرب کے یہودیوں نے اپنے ماحول اور زمانے کی رعایت سے اس میں تبدیلیاں کر لیں، دوسرے مقامی رنگ کی داستانیں، جو اہلِ یمن کا اپنی قدیم تاریخ کے بارے میں تعصب ظاہر کرتی ہیں اور اس علاقائی عصبیت کی نمایندگی کرتی ہیں جو اہلِ یمن پر حاوی تھی اور جس کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ وہ اپنا جدِ اعلیٰ قحطان کو بتاتے ہیں، ان اساطیر کا کچھ حصہ جس کی روایت وہب بن منبہ نے کی ہے عربی کتابوں میں بھی داخل ہو گیا۔ ان میں سے ایک الطبری کی کتاب بھی ہے جس کے بارے میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس نے سیرۃ ابن اسحٰق سے یہ حصہ اخذ کیا ہے۔ اس کے مشائخ میں جو لوگ وہب بن منبہ کی روایات سے واقفیت رکھتے تھے مثلاً

---

[1] لسان المیزان ۴/۷۳۔ [2] ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری (متوفی ۲۷۶ھ) کی عیون الاخبار ۲/۶۲، ۲۷۲، ۲۸۱، ۲۸۳، [3] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۴/۱۰۸۵،

FIHRIST BIBLIOTECA ARABO - HISPANA
WENSINCK P 816, VOL IX P 294

[4] "مواعظ وہب بن منبہ"۔ "حکمت وہب" "حکمۃ آل داؤد" (بروکلمان ضمیمہ جلد ۱/۱۰۱)

© rasailojaraid.com